انیسویں صدی کی داستانیں: ایک جائزہ

ڈاکٹر نسرین بیگم

5324، کوچہ رحمان چاندنی چوک، گلی یعقوب والی، دہلی۔110006، موبائل:9871687157

قصّہ یا کہانی ہماری وہ دلچسپ باتیں ہوتی ہیں جو کسی حکایت، روایت، کتھا یا کسی بیان سے اخذ کر کے پیش کی جاتی ہیں۔ انسان نے کہانی کہنے، سننے، سنانے اور دہرانے سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور اپنی تہذیب و تاریخ کے ابتدائی زمانے سے ہی وہ کہانی قصّے یا کتھا سے شوق و شغف کو ظاہر کرتا رہا۔ اس نے پند و نصائح کی باتیں قصّہ کہانیوں ہی کے انداز سے کیں۔ مسرت اور عبرت کا پہلو بھی انہی قصّے کہانیوں سے لیا اور یہ افسانوی ادب کتھاؤں، مذہبی قصّوں، اخلاقی کہانیوں یا حکیمانہ حکایتوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے۔ ہمارے مذہبی صحیفوں میں قصّے کہانیاں اپنے خاص مقصد کے ساتھ موجود ہیں۔

انیسویں صدی سے پیشتر قصّہ نگاری نظم و نثر دونوں میں ہوتی رہی، مگر نثر میں قصّے کم لکھے گئے اور نظم میں زیادہ۔ ایسے بھی قصّے ملتے ہیں جن میں قصّے کے اجزا ایک دوسرے سے بہت مشابہ اور متاثر نظر آتے ہیں۔ کہانیوں میں ایسا ہوتا رہا ہے کیونکہ کہانیاں زبان بہ زبان، زمین بہ زمین اور زمانہ بہ زمانہ سفر کرتی رہتی ہیں اور انسان کی سوچ و فکر کو نئے سانچوں میں ڈھالتی رہتی ہیں۔

اردو میں انیسویں صدی سے پیشتر کہانی کا رواج اچھے خاصے بڑے پیمانے پر رہا تبھی تو رفتہ رفتہ چھوٹی اور نسبتاً بڑی کہانیوں نے مل کر داستان کی شکل اختیار کی۔ داستان بھی دراصل قصّہ ہی ہوتی ہے، مگر اس میں سلسلہ در سلسلہ بہت سے قصّے شامل ہو جاتے ہیں اور ایک داستان بن جاتے ہیں۔ جس میں خیالی واقعات کی بہتات ہوتی ہے اور حسن و عشق کی کارفرمائیاں، مافوق الفطرت عناصر کی موجودگی، خیالی مہمات کو سر کرنا اور ساتھ ہی بیان کی دلکشی سامعین یا قارئین کو فرحت و مسرت پہنچاتی تھی۔ داستانوں کا مقصد ہی لطف و انبساط پہنچانا تھا۔

انیسویں صدی سے پیشتر لکھی گئیں چند اہم تصانیف میں ایک ''سب رس'' کا قصّہ ہے جو ''حسن و دل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے مُلّا وجہی نے مسجع و مقفیٰ نثر میں بڑے دلچسپ تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک آزاد ترجمہ ہے جس میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ نثری داستانوں میں بہ اعتبارِ زمانہ ''سب رس'' سرِ فہرست ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۶۳۵ء ہے۔ دکنی ادب کا خوبصورت نمونہ ہے۔

تاریخی اعتبار سے ''قصّہ مہر افروز و دلبر'' قدیم اردو قصّوں کی نثری کڑی ہے جس کے مصنف عیسوی خاں بہادر ہیں۔ شمالی ہند کا یہ قصّہ طبع زاد ہے اور مختصر داستان ہے۔ اس کی زبان سادہ و سلیس ہے۔ مصنف نے اکثر تشبیہیں بلا تکلف ہندی شاعری سے لی ہیں۔ اس میں فارسی، اردو یا ہندی کا ایک شعر یا ایک دوہا بھی نہیں ہے۔ اردو اشعار کی غیر موجودگی سے اس کی قدامت مسلم ہے۔ اس کا سنہ تالیف ۱۷۳۲ء سے ۱۷۵۹ء کے درمیان ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کی دوسری اہم داستان نوطرز مرصع ہے۔ قصّہ مہر افروز و دلبر جس وقت دستیاب نہیں ہوئی تھی نوطرز مرصع ہی کو شمالی ہند کی پہلی نثری داستان سمجھا جاتا تھا اس کے مؤلف میر عطا حسین خاں تحسین ہیں جسے فارسی قصّہ چہار درویش سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۷۷۵ء سے قبل لکھی گئی جسے تحسین نے مرصع کاری کے نمونے کے طور پر پیش کیا جو کہ اس وقت کا معیارِ فن تھا۔ بلاشبہ ادب کا بہترین نمونہ ہے۔

دراصل اٹھارہویں صدی عیسوی میں اردو نثر میں داستانوں کی روایت شروع ہو گئی تھی۔ محمد شاہ کے عہد میں قصّہ مہر افروز و دلبر لکھی گئی۔ اس صدی کے نصف آخر میں نوطرزِ مرصع اور پھر اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص'' ہے جو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دادا تھے۔ عجائب القصص کی زبان آرائش اور بناوٹ سے پاک ہے، معیاری زبان ہے جو فورٹ ولیم کالج کی داستانوں سے کچھ پہلے قلم بند کی گئی۔ ادبی نقطۂ نظر سے اسلوب نیا ہے۔ جس میں مغلوں کی معاشرت کی بھرپور عکاسی ہے۔ شاہ عالم نے قصّے کو نابینا ہونے کی صورت میں بول کر عام فہم اور خواص پسند کے انداز پر لکھوایا۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام تک اردو کا نثری سرمایہ تصوف کے چند رسائل جیسے معراج العاشقین، سودا کے دیوان مراثی کا دیباچہ اور ملا وجہی کی سب رس، فضل علی فضلی کی کربل کتھا، عیسوی خاں بہادر کا قصّہ مہر افروز و دلبر اور شاہ عالم کا قصّہ عجائب القصص تک ہی محدود تھا۔ مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہو رہا تھا اور برطانوی سامراجیت دھیرے دھیرے ملک کے مختلف حصّوں پر قابض ہوتی چلی جارہی تھی۔ جنگ پلاسی اور جنگِ بکسر نے انگریزوں کو مکمل طور پر اس ملک کا حکمراں بنا ڈالا۔

اب ملک کے نظم ونسق کو سنبھالنے کے لیے نو وارد انگریز ہندوستان آنے لگے چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کی تعلیم وتربیت کے لیے کوئی ادارہ قائم کیا جائے جہاں یہ ہندوستانی زبان کو پڑھ سکیں اور یہاں کی تہذیب سے واقف ہوسکیں چنانچہ انگریزوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ جس میں ہندوستانی زبانوں کے صدرِ شعبہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے۔ جنھوں نے اردو سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہوئے اپنی نگرانی میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کروایا اور اس کے لیے دور دور سے لوگوں کو بلایا۔ جو لوگ اس کالج سے وابستہ ہوئے ان میں میر بہادر علی حسینی، میر امن، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، بینی نرائن جہاں، خلیل احمد خاں اشک، کندن لال اور للولال جی وغیرہ تھے۔

ان مصنّفین نے بہت سی کتابوں کو عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کیا۔ میر امن نے نوطرزِ مرصع کو باغ وبہار کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ گنج خوبی بھی لکھی۔ حیدر بخش حیدری نے آرائش محفل اور طوطا کہانی کا فارسی سے ترجمہ کیا۔ میر شیر علی افسوس نے باغ اردو لکھی، کاظم علی جوان نے شکنتلا ناٹک کا ترجمہ کیا۔ مرزا علی لطف نے گلشن ہند، نہال چند لاہوری نے مذہب عشق تحریر کیا، میر بہادر علی حسینی نے اخلاق ہندی اور شیخ حفیظ الدین نے خرد افروز لکھی۔ علاوہ بریں ان مصنّفین اور دیگر نے اور بھی قصّے لکھے جو بہت مشہور ہوئے۔

فورٹ ولیم کالج کا مقصد درسی کتب تیار کرنا تھا اس لیے گلکرسٹ نے مصنّفین کو بطورِ خاص سلیس نگاری کی ہدایت دی اور یوں اردو میں سادہ نگاری کا آغاز ہوا۔ میر امن کی باغ وبہار تو اردو والوں کے لیے بقول خواجہ احمد فاروقی مصری کی ڈلیاں اور شربت کے گھونٹ ثابت ہوئے۔ انھوں نے سادہ، سلیس، رواں انداز میں لکھ کر شہرت عام حاصل کی۔ یہ داستان ۱۸۰۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس میں اس زمانے کی معاشرت کی بھرپور عکاسی ہے۔ شروع سے آخر تک عہد مغلیہ کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ کرداروں سے لے کر رسم ورواج، رہن سہن، کھانے پینے کے آداب تک کی تہذیب معاشرتی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور بقول سید عبداللہ اس کی نثر زندہ نثر ہے۔

حیدر بخش حیدری نے حاتم طائی کے ہفت خوان کی داستان کو ''آرائش محفل'' کے نام سے ۱۸۰۱ء میں اردو میں منتقل کیا۔ اس داستان میں ہندوستانی عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔ یوں تو یہ سات سوالوں کی داستان ہے، مگر ایک سوال میں ہی کئی داستانیں شامل ہیں جو تہذیبی قدروں کو واضح کرتی ہیں، اس کے علاوہ حیدری نے طوطا کہانی کا سید محمد قادری کے فارسی نسخے ''طوطی نامہ'' سے ترجمہ کیا۔ اس کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ اس میں طوطے کے ذریعے کہی گئی سبق آموز کہانیاں ہیں جس میں عوامی زندگی چلتی پھرتی فعال نظر آتی ہے۔ بعض کہانیوں میں ہندو عہد کی جھلکیاں ہیں تو بعض میں سلطانی عہد کے نظارے، کہیں مغل دور کے مرقعے کہیں، تو ہیں راجے مہاراجے اپنے تمام تہذیبی مناظر کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ حیدری کی دونوں داستانوں کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔

نہال چند لاہوری کی مذہب عشق بھی فورٹ ولیم کالج ہی کے زیر سرپرستی شائع ہوئی۔ یہ داستان بھی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کی حامل ہے جس میں ہندوستانی تمدن ومعاشرت پیش پیش ہے۔ داستان مذہب عشق دراصل فارسی قصّہ تاج الملوک اور بکاؤلی کا ترجمہ ہے جو گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا۔ یہ داستان تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے زیرنگرانی جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں کچھ طبع زاد تھیں اور کچھ تراجم تھے، مگر زیادہ تر قصّے تھے۔ یہ کالج کی ہی دین تھی کہ جس نے سرسید تحریک اور دہلی کالج کو اردو نثر کا سادہ وسلیس اسلوب دیا اور ایسی زمین فراہم کی جس پر سرسید اور ان کے رفقا نے جدید اردو نثر کی ایک بلند وبالا عمارت تعمیر کی۔

فورٹ ولیم کالج کی داستانوں سے متاثر ہوکر کالج سے باہر کچھ دیگر اہل قلم بھی داستانوں کی طرف متوجہ ہوئے ان میں سید انشاء اللہ خاں انشاء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے ''رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی'' لکھی جو طبع زاد ہے اور خالص ہندوستانی زبان میں ہے جس میں شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی کہ عربی، فارسی یا کسی دوسری زبان کا کوئی لفظ اس میں نہ آنے پائے۔ کہانی دلچسپ ہے اندازِ بیان دلکش ہے۔ کہنے کو تو یہ ۵۰، ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں داستان کے

تمام اجزائے ترکیبی موجود ہیں۔ انشاء کے طریقۂ پیشکش نے داستان کو ناول سے قریب تر کر دیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۰۳ء ہے۔ اس کہانی کو ہندی اور اردو والے دونوں اپنا قدیم سرمایہ سمجھتے ہیں۔ یہ داستان کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔

باغ و بہار کی مقبولیت سے متاثر ہوکر رجب علی بیگ سرورؔ نے ''نوطرزِ مرصع'' کی طرز میں ۱۸۳۷ء میں فسانۂ عجائب لکھی۔ سرور کا اسلوب مسجع، مقفیٰ اور مرصع ہے۔ یہ طبع زاد قصّہ ہے، مگر اس میں مروجہ قصوں اور مثنویوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ داستان میں روانی ہے۔ باغ و بہار میں میر امن نے اگر دلی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے تو فسانۂ عجائب میں سرورؔ نے لکھنوی معاشرت کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کیے ہیں۔ اپنے جاندار اسلوب اور معاشرت کی بھرپور عکاسی کی وجہ سے اس کو اردو داستانوں میں انفرادیت حاصل ہے۔

بہرحال انیسوی صدی کے آخر تک اور بہت سی داستانیں تصنیف ہوئیں جن میں محمد بخش مہجور کی نورتن، نیم چند کھتری کی گلِ صنوبر، سخن دہلوی کی سردشِ سخن وغیرہ ہیں جو کافی مقبول رہیں۔ نثری داستانوں کا یہ دور بوستانِ خیال، الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ جیسی طول وطویل اور کبھی نہ ختم ہونے والی داستانوں کا بھی ہے۔

فارسی میں بوستانِ خیال کے ۱۵ حصّے ہیں اور پہلے مترجم مرزا غالب کے بھتیجے خواجہ امان دہلوی ہیں۔ خواجہ امان کی ترجمہ کی ہوئی پہلی جلد ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ داستان ''الف لیلہ'' حکایت الجلیلہ، ہزار داستان اور الف لیلہ شہزادے کے نام سے متعدد بار چھپی۔ داستان امیر حمزہ بھی متعدد بار مختلف ناموں سے شائع ہوتی رہی۔

بالآخر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ہمارے ادب کو نئے زاویوں سے روشناس کرایا۔ یوروپ کے صنعتی انقلاب اور اس کے پیدا شدہ حالات بھی ہمارے ملک میں پہنچ رہے تھے۔ حالات اور تقاضے کچھ اس طرح کے تھے کہ قبول کیا جانا ناگزیر ہوگیا تھا۔ نتیجے میں فراغت اور فرصت کے طویل لمحات ختم ہونے لگے۔ پھر نہ تو انسان کے پاس داستان کہنے کا وقت رہا نہ سننے کا لہٰذا داستانوں کا یہ رنگین دور ختم ہونے لگا۔ داستانوں کا طلسم ٹوٹ گیا اور انسان تو ہم کی فضاؤں سے نکل کر حقائق کی دنیا میں پہنچا تو داستانوں کی جگہ ناول اور بعد ازاں افسانے نے لے لی۔ انیسویں صدی داستانوں کے عروج کی صدی تھی جس نے قصّے کے ارتقا میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

بہرحال داستانیں ہمارے ماضی کا بیش قیمت ورثہ ہیں جس میں جیتی جاتی معاشرت کے نمونے پھیلے ہوئے ہیں۔ داستانوں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ انہی داستانوں نے اردو نثر کو فروغ دیا۔ نثر کو نہ صرف دلکش و دلنواز بنایا بلکہ متعدد اسالیب سے بھی ہمیں روشناس کرایا۔ داستانوں میں الفاظ کا خزانہ ہے جس میں محاوروں، کہاوتوں، تشبیہوں، استعاروں، تمثیلوں اور تراکیب کے بیش بہا جواہرات پوشیدہ ہیں۔

داستانوں کے مطالعے کی اہمیت آج یوں بھی ہے کہ ہم اس کے قصّے، کرداروں کو یا تہذیبی ماحول، تاریخی ماحول یا تاریخی فضا کو ایک دوسرے سے وابستہ کر کے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں جس سے بہت سی روایتوں کے تسلسل اور تواتر کو سمجھا جاسکتا ہے اور یہی قصّے اور کہانی آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کے کردار آج بھی ہم کو مختلف انداز میں زندۂ جاوید دکھائی دیتے ہیں۔

○○

سائنس کے منتخب مضامین

اس کتاب کے مصنف محمد خلیل بنیادی طور پر ایک سائنس داں۔ انھوں نے طویل عرصے تک مرکزی حکومت کے زیر انتظام شائع ہونے والے میگزین ''سائنس کی دنیا'' کی ادارت کی ہے۔ وہ اس بات سے بڑی حد تک واقف ہیں کہ بچوں کے لیے کس طرح کے سائنسی مضامین پیش کریں۔ اس کتاب میں انھوں نے سادہ اور سہل انداز میں بچوں کو سائنس کی باتیں بتائیں ہیں اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ سائنس کوئی مشکل موضوع نہیں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان موضوعات کو منتخب کیا ہے جو ہمارے اردگرد بکھرے ہوتے ہیں اور باتوں باتوں میں بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس کی ترقیات نے انسانی زندگی پر بڑا مثبت اثر ڈالا ہے اور انسانی زندگی کے اکثر شعبے سائنس کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ اس کتاب میں شامل بعض مضامین ایسے ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کریں گے۔

مصنف: محمد خلیل صفحات: ۸۰، قیمت: تیس روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی